محمد جعفر شاہ ندوی

ایک حدیث

خطا کاری

ترمذی میں سیدنا انسؓ سے حضورؐ کا ایک فرمان یوں مروی ہے :

کل بنی آدم خطّاء وخیر الخطائین التوابون ۔

بنی آدم بڑے ہی خطا کار ہوتے ہیں لیکن بہترین خطا کار وہ لوگ ہیں جو بڑے توبہ کرنیوالے بھی ہوں ۔

عبارت اور اس کا ترجمہ دونوں بہت صاف اور واضح ہیں ۔ مضمون بہت سادہ اور مختصر ہے ۔ لیکن اس کوزے میں داستانِ فطرتِ انسانی کا ایک بڑا اتھاہ سمندر بند ہے ۔ بنی آدم کی پوری تاریخ اور فطرتِ انسانی کی ساری داستان میں جو حقیقت سب سے زیادہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے وہ اس کی لغزشیں، خطائیں، ٹھوکریں، غلطیاں ہی ہیں ——

انسان صرف ظلوم و جہول، کفور و عجول ہی نہیں وہ خطّاء (بڑا ہی خطا کار) بھی ہے ۔ اتنا خطا کار کہ کہنے والوں کو آخر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ الانسان مرکّبٌ من الخطاء والنسیان ۔ انسان کی تو ترکیب ہی خطا و نسیان سے ہوتی ہے ۔ فی الواقع یہ ناممکن ہے کہ کوئی ذی روح جامۂ بشریت پہن کر دنیا میں آئے اور وہ غلطی اور بھول سے پاک ہو ۔

اس پوری کائنات پر ایک نگاہِ تجسس ڈالیے ۔ کوئی ذی روح یا غیر ذی روح مخلوق ایسی نہیں جو خطا کرتی ہو ۔ پہاڑ اور دریا غلطی نہیں کرتے ۔ کواکب و سیارات خطا کے مرتکب نہیں ہوتے ۔ نباتات سے کوئی لغزش نہیں ہوتی ۔ کسی رینگنے والے کیڑے، چرنے والے چوپائے، اڑنے والے پرندے اور پھاڑنے والے درندے سے چوک نہیں ہوتی ۔ لیکن سب سے زیادہ ارتقا یافتہ اور اشرف ترین مخلوق —— انسان —— ؟ ۔ کچھ نہ پوچھیے ۔ خطاؤں کا مجسمہ، لغزشوں کا پتلا اور غلطیوں کا مجموعہ ۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہی وہ "شر" ہے جو اس کا طرۂ شرف و امتیاز ہے اور سببِ "خیر کثیر" ہے ۔ یہ نہ ہو تو انسان شرفِ انسانیت سے نیچے گر کر نباتات و جمادات کی صف میں شامل ہو جاتا ہے اور یہ ہو تو یہی زینۂ ارتقا بن جاتا ہے ۔ یہ عجیب شر ہے جو اپنے جلو میں بے شمار خیر لئے ہوئے ہے ۔

ہاں "خطا" کے معنی بھی لینا چاہیئے ۔ اس سے اس حدیث کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملے گی :

ہر وہ فعل جو اپنے ارادے کے خلاف ہو خطا ہوتا ہے ۔ نیت بخیر ہو مگر نتیجہ غلط نکلے، نیت درست نہ ہو اور نتیجہ خیر ہو ۔ دونوں ہی خطا ہیں ۔ نشانہ شکار پر ہو اور لگ جائے کسی انسان کو یا اس کے برعکس نشانہ ہو انسان اور جا بیٹھے کسی درندے پر ۔ خطا دونوں ہی ہیں ۔ پہلے پر عند اللہ گرفت نہیں مگر عند الناس ہے ۔ اور دوسرے پر عند اللہ گرفت ہے اور عند الناس

نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عند القضا وقوعِ پر گرفت ہوتی ہے۔ اور عند اللہ نیت پر۔

اور اگر غلط نیت کے مطابق ہی عمل کا بھی ظہور ہو تو عند اللہ بھی گرفت ہے اور عند الناس بھی۔ یعنی اگر انسان ہی کو نشانہ بنایا جائے اور وہ نشانہ بیٹھے بھی انسان ہی پر تو عند اللہ بھی گرفت ہے اور عند القضا بھی۔ قرآنی زبان میں بڑے سے بڑا جرم بھی خطا ہے۔ مثلاً ان قتلھم کان خطاءً کبیراً o (ان کا قتل بڑی خطا تھی)۔ اور چھوٹے گناہ بھی خطا میں داخل ہیں۔ مثلاً: نغفر لکم خطایاکم (ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے) حتیٰ کہ وہ چھوٹی چھوٹی لغزشیں بھی خطا میں داخل ہیں جو قابلِ گرفت ہی نہیں مثلاً لیس علیکم جناح فیما اخطاتم بہ۔ (خطاؤں میں تم پر کوئی گناہ نہیں)

زیر بحث حدیث میں سب طرح کی خطائیں داخل ہیں۔ بڑے سے بڑا گناہ بھی اور چھوٹی سی چھوٹی لغزش بھی۔ یہ سب کچھ انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ البتہ انسانی درجات کے مطابق ہی ان خطاؤں کا وزن متعین ہوتا ہے۔ ایک معمولی سی خطا ایک مقرب کے لئے بڑا گناہ ہوتا ہے اور ایک بڑا گناہ معمولی انسان کے لئے قابلِ درگزر ہوتا ہے۔

جہاں تک ذنوب و معاصی کا تعلق ہے خطائیں یہ بھی ہیں اور یہ خطائیں بالعمد ہی ہوا کرتی ہیں۔ یہ خطائیں اصغر الصغائر سے لے کر اکبر الکبائر تک مختلف درجات رکھتی ہیں۔ ان کے متعلق عام اہلِ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ سعید روحیں ان کے بالعمد ارتکاب سے محفوظ ہوتی ہیں۔ مثلاً انبیا کی جبلت و سرشت ہی ایسے خمیر سے ہوتی ہے کہ ان سے کوئی معصیت نہیں ہوتی۔ کبائر کا تو ذکر ہی کیا ہے صغائر بھی ان سے بالعمد نہیں ہوتے۔ ہاں بہت معمولی صغائر ہو جاتے ہیں لیکن وہ بھی اس طور پر کہ ان کے ارتکاب میں نہ ان کی نیت کو کوئی دخل ہوتا ہے نہ قصد و عمد کو بلکہ بلا ارادہ و نیت کسی غلط فہمی سے کوئی چوک ایسی ہو جاتی ہے جس میں ہوتے تو ہیں وہ نیک نیت، لیکن نتیجہ کچھ غلط سا ہو جاتا ہے۔ بہر حال خطا یہ بھی ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انبیا معصوم عن المعصیت تو ہوتے ہیں معصوم عن الخطا نہیں ہوتے یعنی وہ کسی گناہ کا ارتکاب بلکہ ارادہ بھی نہیں کرتے مگر لغزش، چوک اور غلط فہمی ہو جاتی ہے اور ان کی رفعتِ مقام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پر بھی ان سے باز پرس یا تنبیہ فرماتا ہے۔ قرآن پاک میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ بہر حال زیر بحث حدیث میں کل بنی آدم خطاء (تمام بنی آدم خطا کار ہیں) کی کلیت اپنی جگہ صحیح ہے اور مراتب اور اندازِ مواخذہ کے فرق کے ساتھ انبیاء و اولیا بھی اسی کلیت سے باہر نہیں۔

اس حقیقت کی تائید میں قرآنِ پاک کی وہ آیات پیشِ نظر رکھنی چاہیے جن کا تعلق قصۂ آدم سے ہے۔ یہ قصّہ آدم کوئی ڈرامہ نہیں جو اللہ میاں کے سامنے کھیلا گیا ہو بلکہ یہ فطرتِ بشری، فطرتِ مَلَکی اور فطرتِ شیطانی کی داستان ہے زبانِ حال سے۔ ایک حقیقت ہے جسے تمثیلی زبان میں تمثیلچہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہاں آدم سے مراد ہی نوعِ بشری ہے جس کی سرشت میں خطا کاریاں موجود ہیں۔ دوسری طرف نوعِ مَلَک ہے جس کی فطرت معصوم ہے۔ لیکن یہ تماشا بھی دیکھنے کے لائق ہے کہ ملائکۂ معصومینؑ کے ہوتے بھی تاجِ خلافت خطا کار آدم کے سر پر رکھ دیا گیا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس خطاکار کے آگے معصوموں کے ہجوم کو سجدہ ریز کر دیا گیا۔ اور یہ حکم سجدہ اتنا زوردار تھا کہ جس نے اس سے انکار کیا اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندہ دیا گیا۔

ذرا سوچئے کہ آخر یہ خطاکاری کون سی ایسی صفت ہے جس نے معصوموں کو بھی اپنے آگے جھکا لیا؟ سچ پوچھئے تو محض معصومیت کوئی بڑا کمال نہیں۔ معصوم تو شیر خوار بچہ بھی ہوتا ہے تو کیا آپ کوئی منصب امامت و خطابت اس کے سپرد کریں گے؟ معصوم تو ہر حیوانِ مطلق، ہر شجر و حجر ہوتا ہے، تو کیا آپ ان کو مستحق خلافت ٹھہرائیں گے؟ معصوم تو ملائکہ بھی ہیں لیکن کیا خدا نے ان کو زمین کا خلیفہ بنایا؟ —— آخر اس خطاکاری میں کون سی خیر اور کون سا حسن و جمال تھا جو منصبِ خلافت کے لئے نوعِ بشر کو منتخب کر لیا گیا؟ بات کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں معصومیت میں ارتقا نہیں ہوتا۔ معصوم نہ گھٹے نہ بڑھے۔ وہ جوں کا توں رہتا ہے۔ شجر، شجر ہی رہتا ہے اور حجر حجر ہی رہے گا۔ پرندہ پرندہ ہی رہتا ہے اور درندہ درندہ ہی رہے گا۔ نہ اس میں کوئی تنزل ہے نہ ترقی۔ یہ سب بے خطا ہیں اور بے خطا ہی رہیں گے لیکن انسان؟ خطا و نسیان کا مجموعہ ہے۔ یہ ٹھوکر کھاتا ہے اور سنبھلتا ہے۔ غلطی کرتا ہے اور تلافی کرتا ہے۔ اس میں ترقی اور تنزل دونوں کے بھرپور امکانات موجود ہیں۔ یہ چاہے تو اپنی خطاکاریوں سے اپنے آپ کو گرا کر چوپایوں کی صف میں لے آئے بلکہ ان سے بھی بدتر ہو جائے اور چاہے تو اپنی خطاکاریوں کی غیر معمولی تلافی کر کے نہ فقط اپنے داغ کو دھو دے بلکہ پہلے سے زیادہ چمک اٹھے۔ انسان صرف قانون تکوینی کا پابند نہیں بنایا گیا ہے —— تقدیر کے پابند نباتات و جمادات —— بلکہ اختیارات کی لامحدود دنیا اس کے سپرد کی گئی ہے۔ یہ چاہے تو خطا کر کے ابلیس سے بھی اپنے آپ پر لعنت کرائے اور چاہے تو توبہ و انابت کے بعد فرشتوں سے بھی اپنے آپ کو سجدہ کرائے۔ وھدینٰہ النجدین —— اور إمّا شاکرا و امّا کفورا۔ سب کچھ اس کے حیطۂ اقتدار و اختیار میں ہے۔ صلاحیت خطا نہ ہوتی تو یہ رتبہ و منصب کہاں سے حاصل ہوتا؟ یہی سبب ہے کہ جہاں حضور اکرمؐ نے یہ فرمایا کہ:

کل بنی آدم خطاء

تمام بنی آدم خطاکار ہیں

وہیں یہ بھی بتا دیا کہ: وخیر الخطائین التوابون

بہترین خطاکار وہ ہیں جو توبہ کر کے تلافی کر لیتے ہیں

معصومیّت میں یہ کمال کہاں؟ یہ شرف تو خطاکاری ہی کو حاصل ہے کہ یہ انسان کو جتنا نیچے لے جاتی ہے توبہ اس سے کہیں زیادہ اونچا لے جاتی ہے۔

یہ حدیث ایک بہت بڑے نفسیاتی مرض کا علاج بھی ہے۔ کمزور طبائع کے انسان احساس زیادہ ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کا دل بیٹھنے لگتا ہے ہمتیں پست ہو جاتی ہیں اور یاس و ناامیدی کی گھٹائیں چھانے لگتی ہیں۔ اس

حدیث میں یہی حقیقت بتائی گئی ہے کہ خطا تو انسان کی سرشت میں موجود ہے اس لئے اس سے شکستہ خاطر ہونے کی بجائے اس کی تلافی میں لگ جانا چاہیئے۔ اگر انسان اپنی ہر خطا پر وقفِ ماتم ہو کر بیٹھ جائے تو کوئی ارتقائی قدم نہیں اُٹھ سکتا۔ انسانی ترقی اسی میں مضمر ہے کہ ٹھوکر کھا کر سنبھلے مگر چلتا جائے۔ کوشش یہ کرے کہ اب پھر ایسی ٹھوکر نہ لگے اور جو ٹھوکر لگ چکی ہے اس کی ایسی تلافی ہو کہ داغ دھل جائے اور چمک اٹھے۔ اپنی سیاہی کے گرد حسن و جمال کا اتنا بڑا حلقہ بنائے کہ وہ داغِ سیاہ خالِ رخ کی طرح زیبائشِ حسن کو دوبالا کرے۔ اور اسی طرح اپنی ساری عمر اسی جدوجہد کیلئے وقف کرے۔

خطاکاریوں کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جانا اور حد سے زیادہ اثر لیتے رہنا خود ایک بہت بڑی خطا ہے۔ بیشتر خطا کے لئے ہے خطا بشر کے لئے۔ احساس گناہ و خطا ہی مفید ہے جو مایوس نہ کرے بلکہ تلافی پر ابھارے اور بے چین کر دے۔ اسی کا نام ہے توبہ؛ اور یہی ہے وہ بشارت جو زیرِ بحث حدیث میں یوں دی گئی ہے کہ:

وخیر الخطائین التوابون

بہترین خطاکار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں

توبہ کے معنی زبان سے "توبہ توبہ" کی تکرار کرنا نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب ہے اپنے صحیح مقام پر لوٹ آنا۔ اس کی بہت سی شکلیں ہیں۔ یہاں ان سے بحث نہیں۔ توبہ کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ اس غلطی کا اپنے امکان بھر پھر اعادہ نہ کیا جائے اور جو کچھ ہو چکا ہے اس کو اپنی "صواب کاریوں" سے ڈھانپ لیا جائے۔ اسی ڈھانپنے کو مغفرت کہتے ہیں۔

اس مضمونِ حدیث کی تائید میں ایک بڑی معنی خیز حدیث اور بھی ہے جو مسلم نے ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے حضورؐ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لولم تذنبوا لذھب اللہ بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون فیغفر لھم۔

قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم ارتکابِ گناہ ہی نہ کرتے تو اللہ تمہیں رخصت کر کے ایک ایسی اُمت کو پیدا کر دیتا جو گناہ کر کے مغفرت طلب کرتی اور اللہ ان کی مغفرت فرماتا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بالعمد گناہ ضرور کرنا چاہیئے۔ اس میں دراصل فطرت انسانی کو بتایا گیا ہے کہ بہرحال گناہ اس سے ہو ہی جاتا ہے۔ اگر نہ ہوتا تو انسان زیادہ سے زیادہ معصوم فرشتہ ہوتا، یا بے گناہ جانور۔ پھر خلافتِ ارضی کے لئے آخر ایک دوسری ہی مخلوق کی ضرورت ہوتی جو انسان کی طرح امکانِ خطا کے ساتھ ساتھ امکانِ ارتقا کی حامل ہوتی۔

غرض انسان عجیب مخلوق ہے جس کی خیر اس کے شر سے وابستہ ہے اور اس کا ارتقا اس کی خطاکاریوں کے پہلو بہ پہلو ہے۔